آزادی مذہب اور جرم ارتداد: عالمی منشور برائے انسانی حقوق کا تنقیدی جائزہ

Apostasy and freedom of religion: A critical analysis of Universal Declaration of Human Rights

آصف جاوید: پی ایچ ڈی سکالر، ادارہ علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، پاکستان
پروفیسر ڈاکٹر محمد سعد صدیقی: ادارہ علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، پاکستان

Abstract:
The universal declaration of human rights adopted by The United Nations General Assembly on 10 December 1948 is contained on fundamental rights of freedom. According to its article 18, everyone has the right to freedom of religion and this right includes freedom of change his religion. On contrary, in Islamic Shariah Law converting of a Muslim and his embersing any religion or faith other than Islam, is called apostasy and treated as a criminal offence. The official penalty of apostasy under Islamic Law is death. In this research paper, a critical evaluation on article 18 of this universal declaration is being presented by authors, in context of Islamic Shariah Law.

Key wards: human rights, Shariah Law, religion.

آئینی اور دستوری تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی حقوق اپنے فکر و عمل میں ایک طویل پس منظر رکھتے ہیں، جس کا آغاز قدیم یونان میں افلاطون اور ارسطو کے انصاف پر مبنی تصور، نظریہ طبقاتی عدل سے ہوتا ہے تاہم برطانیہ کے عظیم منشور (Magna Carta) کو انسانی حقوق کا پہلا جامع مجموعہ قوانین تسلیم کیا جاتا ہے۔ کنگ جان نے امراء کے دباؤ میں آکر ۱۵ جون ۱۲۱۵ کو اپنے دستخط سے میگنا کارٹا پاس کیا تھا۔ میگنا کارٹا کے بعد انسانی حقوق کے قوانین مختلف ارتقائی مراحل سے گزرے ہیں اور برطانیہ ۱۶۸۹ء، امریکہ ۱۷۷۶ء اور فرانس ۱۷۸۹ء میں کسی نہ کسی صورت اپنی بہتر سے بہترین جگہ بناتے رہے ہیں۔[1]

مغربی اقوام کی حقوق انسانی پر مشتمل جدوجہد کا نتیجہ، اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے عالمی منشور کی صورت میں سامنے آیا، جسے دوسری جنگ عظیم کے تناظر میں تشکیل دیا گیا تھا اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ کو پیرس میں اسے منظور کیا اور ساتھ ہی یہ اعلان بھی کیا کہ انسانی حقوق کا یہ عالمی منشور جملہ اقوام کے حصولِ مقصد کا مشترک معیار ہو گا۔

اس وقت اقوام متحدہ کے رکن ممالک کی تعداد ۵۸ تھی، جن میں سے ۴۸ ممالک نے باقاعدہ ووٹ اور دستخط کے ذریعہ اس منشور کی حمایت کا اعلان کیا تھا۔ دو ممالک نے ووٹ ہی کاسٹ نہیں کیا تھا جبکہ باقی ۸ ممالک نے اس سے لاتعلقی کا اظہار کیا تھا۔ ۱۹۵۰ کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اپنی قرارداد نمبر V423 کے ذریعہ تمام رکن ممالک کو پابند کیا ہے کہ وہ ہر سال ۱۰ دسمبر کو اپنے ملک میں حقوق انسانی کا عالمی دن منایا کریں گے۔[2]

انسانی حقوق پر مبنی اقوام متحدہ کا عالمی منشور کل ۳۰ دفعات پر مشتمل ہے، جو ایک فرد کے شہری، سماجی، اقتصادی، سماجی اور ثقافتی حقوق کی ضمانت دیتی ہے۔ منشور کی دفعہ ایک اور دو تمہیدی دفعات ہیں۔ دفعہ تین سے لیکر دفعہ اکیس تک میں، کسی فرد کے شہری اور سیاسی حقوق کو تسلیم کیا گیا ہے، جن میں زندگی کا حق فرد کی آزادی، حکومت میں شرکت کا حق اور سرکاری ملازمت کے حصول کا حق شامل ہیں۔

منشور ہذا کی ۲۲ سے لے کر ۲۷ تک کی دفعات، کسی فرد کے اقتصادی، سماجی اور ثقافتی حقوق سے متعلق ہیں اور دفعہ ۲۸ اور ۲۹ میں، ہر شخص کے سماجی اور بین الاقوامی نظام میں رہنے کا حق اور اس فرد پر عائد معاشرے کا حق بیان کیا گیا ہے۔ دفعہ ۳۰ اس وضاحت پر مشتمل ہے کہ کسی فرد، گروہ اور ملک کو منشور ہذا کے فراہم کردہ حقوق اور عطا کردہ آزادی میں تخریب کاری کا حق حاصل نہیں ہو گا۔[3]

اقوام متحدہ کے مذکورہ منشور میں جن الفاظ اور اصطلاحات کا استعمال کیا گیا ہے، وہ اپنے پس منظر اور پیش منظر کے لحاظ سے ذو معنی ہیں۔ مقالہ نگار کے نزدیک اس کا باعث غالباً یہ ہے کہ اقوام متحدہ نے منشور کو زیادہ سے زیادہ اقوام کے لئے قابل قبول بنانا تھا، اس مقصد کی خاطر ذو معنی یا کثیر معنی الفاظ و تراکیب کا استعمال کیا گیا ہے اور اس پر مستزاد یہ ہے کہ دنیا کی غالب طاقتیں، ضرورت کے وقت اپنے

حالات و تصورات کی مناسبت سے ان کی تشریح کرتی ہیں اور اسی تشریح کے مطابق فیصلہ کرتی ہیں۔ بہر حال، بظاہر ذو معنی الفاظ پر مشتمل اس منشور کی اکثر دفعات ایک حد تک اسلام سے بھی مطابقت رکھتی ہیں، یہی باعث ہے کہ بعض مستند اہل علم نے کثیر الاستعمال الفاظ کی بنا پر مذکورہ انسانی حقوق کو قبول کیا ہے تاہم اسلامی حقوق انسانی اور مغربی ہیومن رائٹس میں بعض تضادات ناقابل تطبیق ہیں چنانچہ عالمی منشور کی تقریباً دو تہائی دفعات، اسلام کے ساتھ لفظی مشابہت رکھتی ہیں اور ایک تہائی دفعات اسلام سے براہِ راست متصادم ہیں۔

منشور ہذا کی اسلام مخالف دفعات میں سے ایک آرٹیکل ۱۸ بھی ہے، جو انسان کے مذہبی حقوق کی ضمانت پر مشتمل ہے، جس کی رو سے کسی مذہب کے رد و قبول یا ترک و اختیار کے باب میں ہر شخص بنیادی طور پر آزاد ہے اور جس طرح ایک شخص کوئی مذہب اختیار کرنے میں آزاد ہے بالکل اسی طرح وہ، کسی مذہب کو تبدیل کرنے میں بھی آزاد ہے۔ اس عالمی منشور کی دفعہ ۱۸ درج ذیل ہے:

"Everyone has the right to freedom of thought, conscience and religion, this right includes freedom of change his religion or belief, and freedom, either alone or in community with others and in public or private, to manifest his religion or belief in teaching, practice, worship and observance."[4]

"ہر شخص کو آزادیٔ فکر، آزادیٔ ضمیر اور آزادیٔ مذہب کا پورا حق حاصل ہے۔ اس حق میں مذہب یا عقیدے کو تبدیل کرنے اور عوامی یا نجی طور پر، تنہا یا دوسروں کے ساتھ مل کر عقیدے کی تبلیغ، عمل، عبادت اور مذہبی رسومات ادا کرنے کی آزادی شامل ہے۔"

مذکورہ آرٹیکل کی رو سے، اختیارِ مذہب اور تبدیلیٔ مذہب کو انسان کے بنیادی حقوق میں شامل کیا گیا ہے گویا کسی مذہب کو قبول کرنے یا کسی مذہب کو چھوڑ دینے میں ہر شخص بنیادی طور پر آزاد ہے تاہم اس عالمی منشور یا مذکورہ دفعہ میں ایک قانونی سقم موجود تھا اور جناب Hans Kelson کے مطابق، خالص قانونی نقطہ نظر سے دیکھیں تو منشور ہذا کی دفعات کسی ملک کو اسے تسلیم کرنے یا اس کے صراحت کردہ بنیادی حقوق اور آزادی کو تحفظ دینے پر پابند نہیں کرتی ہیں اور منشور کی زبان میں ایسی تعبیر کی گنجائش

نہیں ہے، جس سے یہ مفہوم اخذ ہوتا ہو کہ رکن ممالک اپنے شہریوں کو انسانی حقوق اور بنیادی آزادیاں فراہم کرنے میں قانونی طور پر پابند ہیں۔[5]

چنانچہ عالمی منشور کے مذکورہ قانونی سقم کو دور کرنے اور رکن ممالک کو اس کا پابند بنانے کی غرض سے اقوام متحدہ نے ۱۹۴۹ میں چارٹر برائے ریاستی حقوق و فرائض منظور کیا، جس کے آرٹیکل نمبر ٦ کی رو سے، تمام رکن ممالک کا فرض قرار دیا گیا کہ وہ اپنے شہریوں کے بنیادی حقوق اور آزادی کے تحفظ کو یقینی بنائیں گے۔ چارٹر ھذا کے آرٹیکل کے الفاظ یہ ہیں:

"Every state has the duty to treat all persons under its jurisdiction with respect for human rights and fundamental freedoms, without distinction as to race, sex, language or religion.[6]

"ہر ریاست کا فرض ہے کہ وہ بلا امتیاز نسل، صنف، زبان اور مذہب، اپنے دائرہ حکومت میں تمام شہریوں کے انسانی حقوق اور بنیادی آزادی کا تحفظ کرے گی۔"

مذکورہ آرٹیکل سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مغربی تصور ریاست کی رو سے، ہر ریاست کا یہ فرض ہے کہ وہ افرادِ ریاست کے انسانی حقوق اور آزادی کا تحفظ کرے گی اور بنیادی حقوق اور آزادی کے باب میں کسی قسم کے نسلی، لسانی، جنسی اور مذہبی امتیاز کو روا نہیں رکھے گی گویا دو چیزوں (انسانی حقوق اور آزادی) کا تحفظ کرنا اور چار چیزوں (نسل، صنف، زبان، مذہب) میں امتیاز نہ کرنا، اقوام متحدہ کے تمام رکن ممالک کا ریاستی فرض ہے۔

اقوام متحدہ کے مذکورہ چارٹر کے نتیجہ میں انسان کے بنیادی حقوق کا تحفظ کرنا ریاست کا فریضہ قرار پایا ہے اور اب یہ انسانی حقوق ہر ملک کے دستور کا لازمی حصہ ہیں اور تمام رکن ممالک کے دساتیر میں آزادی اور انسانی حقوق کی بنیادیں سو فیصد مشترک ہیں اور انہی کے تناظر میں تمام معاشرتی حقوق کا تعین کیا جاتا ہے۔ خود ہمارے پاکستانی دستور کا باب اوّل بنیادی حقوق کے بارہ میں ہے، جس کے آرٹیکل ۸ تا ۲۸ میں، اقوام متحدہ کے پیش کردہ انسانی حقوق کو اصولاً قبول کر کے ملک میں نافذ کر دیا گیا ہے۔[7]

اقوام متحدہ کے عالمی منشور ۱۹۴۸ میں فرد کو آزادی مذہب کا بنیادی حق دیا گیا تھا اور ۱۹۴۹ کے چارٹر میں ریاست کو اس آزادی کے تحفظ کا پابند بنا دیا گیا اور ۱۹۶۶ میں آزدی مذہب کے اس بنیادی حق کو جبراً مجروح کرنا بھی اقوام متحدہ کے ایک معاہدہ کی رو سے ممنوع قرار پایا ہے۔

چنانچہ اقوام متحدہ کے بین الاقوامی معاہدہ برائے شہری اور بنیادی حقوق میں واضح طور پر درج کیا گیا ہے کہ ہر شخص، عقیدہ فکر کے اختیار وانتقال میں بالکل آزاد ہے اور کسی شخص پر بھی عقیدہ و فکر کے باب میں کوئی جبر نہیں کیا جاسکے گا، جس کے نتیجہ میں آزادی عقیدہ مذہب کا یہ حق ختم ہوتا ہو۔ اقوام متحدہ کا یہ بین الاقوامی معاہدہ ۱۶ دسمبر ۱۹۶۶ کو منظور ہوا اور اسے ۲۳ مارچ ۱۹۷۶ کو نافذ کر دیا گیا، جس کے آرٹیکل ۱۸ کا سیکشن ۲ درج ذیل ہے:

> "No one shall be subject to coercion which would impair his freedom to have or to adopt a religion or belief of his choice".[8]

> "کسی شخص پر ایسا جبر نہیں کیا جاسکے گا، جس کے تحت اس کی منشا اور مرضی کے مذہب اور عقیدے کو رکھنے یا اختیار کرنے کی آزادی کو مجروح کیا جاسکے۔"

اقوام متحدہ کے نزدیک آزادی مذہب کا یہ حق کتنا بنیادی اور کلیدی حق ہے، اس کا اندازہ ہمیں ایک واقعہ سے ہو جاتا ہے، جب اس کے عطا کردہ اختیار مذہب کے حق اور اسلام کے قانون ارتداد میں عملاً تصادم سامنے آیا اور ۲۰۰۶ میں عبدالرحمن نام کا ایک افغانی شخص، اسلام چھوڑ کر عیسائی بن گیا تھا۔ افغان عدلیہ نے جرم ارتداد کے مرتکب کو سزائے موت کا فیصلہ سنایا۔

بس پھر کیا تھا، مغربی این جی اوز اور میڈیا نے اس پر خوب واویلا کیا اور افغان عدلیہ کے اس فیصلے کو انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزی قرار دے دیا اور اس ایک واقعہ کی بنیاد پر بڑی بڑی ضخیم کتابیں صفحہ شہود پر آئیں چنانچہ اس موضوع پر ایک برطانوی مصنف رچرڈ ڈاکن کا تعجب پر مبنی اقتباس درج ذیل ہے:

> "It is still an article of constitution of liberated Afghanistan that the penalty of apostasy is death. Apostasy, remember, does not mean actual harm to person or property, it is pure thought crime, and the official punishment for it under Islamic law is death".[9]

"ابھی تک آزاد افغانستان کے قانون میں ایک آرٹیکل یہ ہے کہ ارتداد کی سزا قتل ہے۔ یاد رکھیں کہ ارتداد کسی شخص یا پراپرٹی کو حقیقی نقصان پہنچانا نہیں ہے بلکہ ارتداد ایک خالص فکری جرم ہے اور اسلامی قانون کی رو سے اس کی مسلمہ سزا قتل ہے۔"

مغرب کے میڈیائی شور کے نتیجہ میں، اس وقت کے امریکی صدر جارج بش نے بھی اس واقعہ پر یہ بیان جاری کیا کہ میں یہ سن کر بہت بے قرار ہوں کہ ایک شخص نے اسلام چھوڑا ہے اور اس کی پاداش میں اسے سزائے موت سے دوچار کر دیا گیا ہے۔ انتہائی تعجب اور اضطراب کی بات ہے کہ ہم ایک ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد کر رہے ہیں اور وہ ملک کسی شخص کو دوسرا دین اختیار کرنے پر سزائیں سنا رہا ہے۔ آخر کار، امریکہ، فرانس اور برطانیہ کے تعاون سے اس مرتد کو اٹلی بھیج دیا گیا کیونکہ اٹلی نے اس کو اپنی شہریت دینے کی پیشکش میں آمادگی بلکہ پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔[10]

بہر حال، اس واقعہ کے بعد ۲۰۰۷ میں اقوام متحدہ کی نیشنل سیکورٹی کے ریسرچ ڈویژن نے RAND کارپوریشن سے مسلم دنیا اور امریکہ و یورپ کی مسلم کمیونٹی کا ایک سروے کروایا۔ کارپوریشن نے روڈ میپ میں معتدل اور غیر معتدل مسلم کا ایک معیار مقرر کیا اور اس کی رو سے تحقیقی سروے میں گیارہ سوالات پر مشتمل ایک سوال نامہ تیار کیا، جن میں سے چند سوال یہ بھی ہیں:

* کیا آپ اقوام متحدہ کے متفقہ انسانی حقوق کی تائید کرتے ہیں؟
* کیا آپ کے یہاں آزادی مذہب کے باب میں کوئی استثناء موجود ہے؟
* کیا آپ ایمان رکھتے ہیں کہ مذہب تبدیل کرنا انسان کے بنیادی حقوق میں شامل ہے؟

RAND کارپوریشن نے اس تحقیقی سروے کو نتائج و تجاویز کے ساتھ Building Moderate Muslim Network کے نام سے ۶۱۲ صفحات پر مشتمل کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔[11]

جرم ارتداد پر افغان عدلیہ کا سزائے موت پر مبنی فیصلہ اور اس کے خلاف مغربی ممالک کا شدید رد عمل، حقوق انسانی اور آزادی کے باب میں اقوام متحدہ کا اصل چہرہ اور دوہرا معیار واضح کر دیتا ہے جناب Karal Mannheim کے الفاظ میں، عالمی منشور نے کسی فرد کو یہ قانونی حق نہیں دیا ہے کہ وہ منشور

میں فراہم کردہ حقوق اور آزادی میں سے کسی ایک کے سلب ہونے پر بین الاقوامی عدالت انصاف سے اپیل کر سکے۔[12]

اقوام متحدہ نے انسانی حقوق اور آزادی کے پامال ہونے کی صورت میں فرد کی بجائے ریاست کو اپیل کرنے کا حق دیا ہے چنانچہ بین الاقوامی عدالت انصاف کے دائرہ اختیار کی دفعہ ۳۴ میں صراحت کے ساتھ درج ہے کہ اس عدالت کے روبرو مقدمات میں ریاستیں اور ممالک ہی فریق بن سکیں گے، بین الاقوامی عدالت انصاف کی دفعہ ہذا کے الفاظ یہ ہیں:

"Only states may be parties in cases before the court" [13]

"صرف ریاستیں ہی عدالت کے روبرو مقدمات میں فریق بن سکیں گی۔"

مندرجہ بالا دفعہ کے تناظر میں افغان واقعہ کے مطالعہ سے واضح طور پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ مخصوص حالات اور ذاتی مفادات کے وقت تمام اصول وضوابط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اقوام متحدہ کا ادارہ کس طرح اپنے اختیار و اقتدار کو کام میں لاتا ہے چنانچہ افغانی مرتد اپنا آزادیٔ مذہب کا حق پامال ہونے پر اس فیصلہ کے خلاف بین الاقوامی عدالت میں اپیل کرنے کا مجاز نہیں تھا اور افغانی ریاست اگرچہ اس کی مجاز تھی مگر اس نے خود جرم ارتداد کے خلاف سزائے موت کا فیصلہ سنایا تھا۔

اس نے بنیادی حقوق اور آزادی کی نام پر اپیل لے کر عالمی عدالت انصاف میں کیوں جانا تھا؟ اب اصولاً، قانوناً اور اخلاقاً ہونا یہ چاہیے تھا کہ اس واقعہ کو افغانستان کا اندرونی معاملہ قرار دیکر اس میں مداخل نہ ہوا جاتا مگر اقوام متحدہ کی چھتری تلے دنیا کے ٹھانیدار نے ایسا کرنا تھا اور نہ ہی اس نے یہ کیا۔

کیا اسلام کو بھی دیگر مذاہب پر قیاس کیا جائے گا؟

مغربی دنیا میں جن مفکرین نے جمہوریت کی صورت گری میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے، ان میں سے ایک معتبر نام فرانس کے معروف فلسفی وولٹائر (Voltaire) کا بھی ہے۔ اس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ جتنے آسمانی مذاہب ہیں، سب تحریف شدہ ہیں اور انسان کا اصل میں ایک ہی مذہب ہوتا ہے، اور وہ اس کا فطری مذہب ہے، انگلش میں اسے Natural Religion کا نام دیا گیا ہے۔ اسی نے یہ بھی نظریہ دیا

تھا کہ مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے اور انسان کو کسی مذہب کے حق یا باطل ہونے پر قائل کرنا کسی حکومت یا چرچ کا کام نہیں ہے بلکہ مذہب کا اختیار سراسر انسان کا ذاتی مسئلہ ہے، انسان چاہتا ہے تو آسمانی مذہب اختیار کر سکتا ہے حتیٰ کہ بت پرستی کرنے، یہودی یا عیسائی بننے میں بھی انسان آزاد اور خود مختار ہے، حکومت کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور نہ کسی چرچ یا ریاست کو مذہب کے ذاتی معاملہ میں دخل دینے کی ضرورت ہے۔

آج مغربی دنیا میں مذہب کے متعلق جو بھی تصورات پائے جاتے ہیں، وہ اسی نظریہ کی ایک ترقی یافتہ شکل ہیں کہ مذہب اور عقیدہ کے باب میں، حق و باطل کا کوئی سوال نہیں ہے کہ کون سا مذہب حق ہے اور کون سا مذہب باطل ہے؟ بلکہ مذہب انسان کی تسکین ذات کا ذریعہ ہوتا ہے اور جو مذہب بھی انسان کو ذاتی تسکین دے گا، وہی اس کے حق میں برحق ہوگا اور اس بارے میں بحث ومباحثہ اور جدال و مناظرہ کرکے کسی کو قائل کرنا ایک بے کار مشغلہ ہوگا۔ جدید مغربی دنیا میں کسی مذہب کا احترام بھی اس بنا پر نہیں ہے کہ مذہب فی نفسہ کوئی قابل احترام چیز ہوتی ہے بلکہ مذہب میں چونکہ کسی شخص کا سامان تسکین پایا جاتا ہے لہٰذا جیسے وہ خود اپنے مذہب کو قابل احترام سمجھتا ہے، دوسروں کو بھی اس کے اختیار کردہ مذہب کا احترام کرنا چاہیے۔[14]

مذہب کو انسان کا ذاتی معاملہ قرار دے کر اسے کاروبار حکومت سے علیحدہ کرنا والٹائر جیسے فلسفیانہ نظریات پر مبنی ہے جو دراصل چرچ کے اس ظلم و ستم کا ردعمل تھا، جو اس نے تھیاکریسی یا مذہبی جبر کی شکل میں مسیحی عوام پر ڈھایا تھا۔ چرچ کے اس بھیانک کردار سے مغربی مفکرین نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جب تک ہم مذہب کو اجتماعی حیات سے نکال باہر نہیں پھینکیں گے، اس وقت تک ہم ترقی نہ کر سکیں گے۔ چنانچہ اس کے حل میں سیکولر سٹیٹ کا نظریہ پیش کیا گیا جس میں مذہب کو انسان کے اختیاری ردو قبول پر چھوڑ دیا گیا اور اس باب میں اسے بالکل آزاد کر دیا گیا اور یہ ہر اس ملک کا قصہ ہے جس نے انبیاء و

رسل کے پیش کردہ آسمانی مذاہب اور تورات وانجیل کی عطا کردہ خدائی ہدایت کو پس پشت ڈالا اور اپنے جملہ مسائل کا حل ایک خود ساختہ اجتماعی نظام کی شکل میں وضع کیا۔

مذہب سے لاتعلقی کے اس عمل میں دیگر خرابیوں کے ساتھ ساتھ ایک قانونی بدعت یہ بھی رواج پذیر ہوئی کہ آزادی مذہب کے بنیادی حق کے نام پر ارتدادی عمل کو جواز فراہم کر دیا گیا حالانکہ انہی مذاہب کی اصل تعلیمات کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی جرم ارتداد پر موت کی سزا مقرر تھی اور یہ ایک تاریخی حقیقت بھی ہے کہ ریاست کے جدید جمہوری تصور سے قبل، تمام مسیحی دنیا میں مذہبی قانون ہی ان کا ملکی قانون تھا اور صرف مسیحی مذہب ہی پر کیا موقوف، دنیا کے تمام آسمانی مذاہب کی رو سے جرم ارتداد پر سزائے موت کا قانون جاری اور نافذ رہا ہے مگر مذہب سے بغاوت کے نتیجہ میں، الہامی دین کو جمہوری دین سے بدل دیا گیا اور سزائے ارتداد سے انکار، آزادی مذہب کے خود ساختہ حق کا لازمی مطالبہ قرار پایا۔

اہل مغرب نے مظالم چرچ کے رد عمل میں مذہب کے کردار کو محدود کیا تھا اور رد عمل کی نفسیات ہمیشہ جذباتی نفسیات ہوتی ہے اور اس کے نتیجہ میں ہمیشہ پہلے سے بڑی خطا کا امکان ہوتا ہے اور مغربی دنیا میں بھی یہی کچھ ہوا ہے ورنہ انہیں مذہب کو ریاست سے بے دخل کرنے کی بجائے مذہب کا حقیقی چہرہ نکھارنے اور عوام کو دکھانے کی ضرورت تھی کہ چرچ نے مذہب کو کاروبار بنا رکھا تھا، جس نے مذہب کے اصل روپ کو گہنا دیا تھا اور اگر مغرب کے فکر مند اور سنجیدہ مفکرین کا اس حقیقت کی تہ تک پہنچنا ممکن نہ تھا تو انہیں چاہیے تھا۔

کہ دین اسلام سے استفادہ کرتے، جس کا سورج اس وقت پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا، جب مغربی دنیا میں تاریکی کا راج تھا اور اہل مغرب اپنے مذہب سے مایوس ہو رہے تھے۔ اس کا باعث یہ ہے کہ اسلام نے ایک طویل عرصے تک ریاستی سطح پر بھی اپنا کردار ادا کیا تھا اور اپنے عوام پر چرچ کی مانند ظلم و ستم بھی روا نہ رکھا تھا۔ اسلام میں دین اور دنیا کے جدا ہونے کا کوئی تصور تھا اور نہ اس کی قائم

کردہ ریاست میں مذہبی قانون کے علاوہ، دوسرا کوئی قانون ہی رائج تھا مگر صد افسوس، مغربی مفکرین اسلام کی جانب متوجہ نہ ہوئے بلکہ انہوں نے مذہب سے آزادی کو ترقی کا راز جانا اور اسی کو اپنے مسائل کا حل سمجھا۔[15]

کیا عالمی منشور برائے انسانی حقوق ایک آفاقی دستاویز ہے؟:

فکری اور علمی سطح پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسانی حقوق کے منشور کو آخر یہ مقام کیوں دیا جارہا ہے کہ تمام انسانیت کو اس کے مطابق اپنی معیشت، سیاست اور معاشرت استوار کرنے کا پابند بنایا جارہا ہے؟ اقوام متحدہ کے مدار مہام کے نزدیک اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ انسانی حقوق ایک آفاقی دستاویز ہے، اور تمام دنیائے انسانی نے اس دستاویز کو شرف قبول بخشا ہے۔ اہل مغرب کے خیال میں یہ منشور تمام انسانیت کا مشترک ورثہ اور ان کی منزل مقصود ہے۔ تمام انسان انہی حقوق کے حصول کی خاطر زندہ ہیں اور انہیں حاصل کرنا ہی ان کی سب سے بڑی خواہش ہے۔

اقوام متحدہ ڈھٹائی کے ساتھ اسے ایک عالمی منشور اور آفاقی دستاویز قرار دیتا ہے حالانکہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس منشور کا ماخذ امریکی دستور ہے جو امریکہ کے ۴۵ گورے مردوں نے منظور کیا تھا اور اس دستور کی منظوری سے قبل امریکی اخبارات میں دستور کے خدوخال پر تفصیلی مباحثہ ہوا تھا۔ تاریخ میں یہ مباحثہ فیڈرلسٹ پیپرز (The Federalist Papers) کے نام سے معروف ہے۔[16]

اس مباحثے کے نتیجہ میں امریکی دستور کو متعین کیا گیا تھا گویا امریکی دستور کا ماخذ فیڈرلسٹ پیپرز The Federalist Papers ہیں اور عالمی منشور کا ماخذ امریکی دستور ہے۔ اگرچہ اس منشور کو ایک کمیٹی نے تیار کیا تھا، جس کی صدر Eleanor Roosevelt تھیں، جو امریکی صدر روزویلٹ کی اہلیہ تھیں۔ اسی منشور کو آخر میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اپنے ریزولیوشن نمبر 217-A کے تحت ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ میں انسانی حقوق کا عالمی منشور (The Universal Declaration of Human Rights) بنا کر جاری کیا۔[17]

چنانچہ سوال یہ ہے کہ ایک ایسا منشور جس کے جملہ مصنفین امریکی ہوں اور باہمی مباحثے کی بنیاد پر اسے متعین کیا گیا ہو، اسے کس طرح ایک آفاقی منشور قرار دیا جا سکتا ہے؟ حقوق انسانی کا تصور و ماہیت اور اصل و حقیقت آفاقی نہیں ہے بلکہ ایک خاص تہذیب، خاص ثقافت، خاص علاقے اور خاص تاریخ سے مربوط ہے اور کسی طرح بھی اس مخصوص تاریخی اور تہذیبی نسبت سے ماورا نہیں ہے۔ ان حقوق کی بنیادیں خاص زمان و مکان میں محصور، محدود اور مقید ہیں چنانچہ انسانی حقوق اور آزادی کی ان اقدار کو عالمی منشور اور آفاقی دستاویز سمجھنا غیر علمی رویہ ہے اور اس کی آفاقیت کے تمام دعوے غیر حقیقی ہیں۔[18]

جن مغربی مفکرین نے انسانی حقوق کو علمی اور عقلی جواز فراہم کیا تھا، وہ بھی اس سے دستبردار ہو رہے ہیں اور اس کی آفاقیت کا دعوی ترک کرتے دکھائی دیتے ہیں چنانچہ بیسویں صدی کے مشہور لبرل مفکر جان رالز کے خیالات کا تجزیہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مغرب یومن رائٹس کی آفاقیت کا قائل نہیں رہا ہے ۱۹۷۱ میں رالز نے اپنی کتاب Theory of Justice میں ہیومن رائٹس کے آفاقی ہونے کا دعوی پیش کیا تھا اور اس کی مختلف توجیہات بیان کی تھیں۔[19]

۱۹۹۳ میں یہی رالز اپنے خیالات پر ناقد مفکرین کے جواب میں، لبرل فریم ورک کی آفاقیت کے دعویٰ سے دستبردار ہوتا نظر آتا ہے اور اپنی کتاب Political Liberalism میں لبرل فریم ورک کی ایک محدود سیاسی تعبیر پیش کرتا ہے، جو محض امریکی تاریخ سے مطابقت رکھتی ہے۔ [20]

جان رالز جیسا ہیومن رائٹس کا نامور وکیل بالآخر اپنے اس نقطہ نگاہ سے قطعاً پسپائی اختیار کرتا ہے اور اُسے آفاقی نہیں سمجھتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۹۹ء میں شائع شدہ اپنی کتاب Law of People The میں اس خیال کا اظہار کرتا ہے کہ مذکورہ رائٹس صرف بالفعل قائم لبرل معاشروں کے لیے ہی قابل عمل ہیں اور جو معاشرے لبرل نہیں ہیں، وہاں ان کی عملیت پر اصرار کرنا بالفعل غلط ہے۔[21] گویا مغرب کے وہ سیاسی اور لبرل مفکرین، جو انسانی حقوق کی آفاقیت کے قائل رہے ہیں، وہ خود بھی اس کی آفاقیت کے

بارے میں تذبذب کا شکار ہیں چنانچہ عالمی منشور کے انسانی حقوق کو آفاقی سمجھ کر کس طرح اختیار کیا جا سکتا ہے؟ لہٰذا انسانی حقوق کا عالمی منشور کوئی ایسی دستاویز نہیں ہے جس کے پیش کردہ حقوق علمی اور فکری سطح پر مسلمہ حیثیت رکھتے ہوں۔

رالز کے اس نقطہ نگاہ کے بعد اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کی آفاقیت کا دعویٰ دم توڑ جاتا ہے، لہٰذا اس منشور کے دعوائے آفاقیت کی بنیاد پر تمام ممالک میں اثر و نفوذ کرنا، اس بنیاد پر دیگر نظام ہائے زندگی کو چیلنج کرنا اور ان کے بارے میں منفی رائے اختیار کرنا ایک غیر علمی اور غیر عقلی رویہ ہے۔ عالمی منشور برائے انسانی حقوق جن آزادیوں کو فراہم کرتا ہے، بنیادی طور پر وہ آزادیاں ہی محل بحث اور محل نظر ہیں لہٰذا انسانی حقوق کی بنیاد پر آزادی مذہب یا تبدیلی مذہب کے اسلامی ڈسکورس پر تنقید کرنا یا اُسے چیلنج کرنا مغربی دنیا کے لیے قطعاً درست نہیں ہے۔[22]

کیا مغربی نظریات کو اختیار اور رد کرنے میں بھی آزادی ہے؟

اقوام متحدہ نے جس طرح تمام مذاہب کے بارے میں یہ قانون بنایا ہے کہ مذاہب کے ردو قبول یا ترک و اختیار میں انسان کو آزادی حاصل ہے، سوال یہ ہے کہ کیا اقوام متحدہ کا ادارہ بھی اپنے بنیادی نظریات کو رد اور دیگر تصورات کو اختیار کرنے میں آزادی فراہم کرتا ہے؟ مثلاً کیا مغرب اس بات کی آزادی فراہم کرتا ہے کہ کوئی شخص یا ملک نظریہ آزادی ہی کا انکار کر دے ں کہ ہم اجتماعی اور انفرادی سطح پر اس نظریہ آزادی (Freedom) کو ہی رد کرتے ہیں اور اسے تسلیم نہیں کرتے؟ ایسے ہی کیا مغرب اس باب میں بھی آزادی کا قائل ہے کہ کوئی ملک یا فرد انسانی حقوق کے منشور کو ماننے سے انکار کر دے کہ ہم اس کے علاوہ کسی دوسرے قانون کو تسلیم کرتے ہیں؟

اسی طرح مغرب کسی ملک یا فرد کو جمہوریت کی بجائے خلافت یا بادشاہت یا کوئی دوسرا سیاسی نظام رائج کرنے کی آزادی فراہم کرتا ہے؟ ان سوالات کا جواب یہ ہے کہ مغرب اس قسم کی آزادی قطعاً فراہم نہیں کرتا بلکہ اس باب میں مغرب کا رویہ غیر اخلاقی، غیر علمی، انتہائی تعصب اور تشدد پر مبنی ہے

گویا دنیا کے تمام نظریات کے رد و قبول میں ہر شخص آزاد ہے مگر مغرب کے فکری اجتہاد اور علمی تاریخ سے بر آمد شدہ نظریہ اور نظام کے رد و قبول میں کسی کو اختیار حاصل نہیں ہے۔ بلکہ اقوام متحدہ اور اہل مغرب کے نزدیک اس آزادی کو بھی ارتداد تصور کیا جائے گا اور اس کے مرتکب عبرتناک سزا دی جائے گی۔

مولانا مودودیؒ رقم فرماتے ہیں:

"امر واقعہ یہ ہے کہ عیسائیت ان قوموں کے افراد کا محض ایک شخصی مذہب ہے، ان کا اجتماعی دین نہیں ہے جس پر ان کی سوسائٹی کا نظام اور ان کی ریاست کی عمارت قائم ہو۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائیت سے پھر جانے کو وہ کوئی اہمیت نہیں دیتیں کہ اس پر رکاوٹ عائد کرنے کی ضرورت محسوس کریں، رہا ان کا اجتماعی دین جس پر ان کی سوسائٹی اور ریاست کی بنیاد قائم ہوتی ہے تو اس سے مرتد ہونے کو وہ بھی اسی طرح جرم قرار دیتی ہیں، جس طرح اسلام اسے جرم قرار دیتا ہے اور اس کو دبانے میں وہ بھی اتنی ہی سخت ہیں جتنی اسلامی ریاست سخت ہے۔۔۔ اگر آپ اس اجتماعی دین کے اعتقاداً اور عملاً کافر بن جائیں اور کسی دوسرے اجتماعی دین کے اعتقادی مومن بن کر عملی مسلم بننے کی کوشش کریں تو آج کا ہر حکمران آپ کے ساتھ وہی کچھ کرنے کے لیے تیار ہے، جو آج سے ساڑھے تین ہزار برس پہلے کا حکمران حضرت موسیٰؑ کے ساتھ کرنے کے لئے تیار ہوا تھا کہ

﴿ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ﴾[23]

ہیومن رائٹس پر مبنی جمہوری ریاست کا یہ دعوی ہے کہ اس نظام زندگی میں ہر فرد کو حریتِ فکر اور آزادی ضمیر کا حق حاصل ہوتا ہے اور وہ ہر قسم کی فکری اور علمی آزادی کا حامل ہوتا ہے مگر حقیقت میں یہ ایک جھوٹا دعویٰ ہے کیونکہ اس نظام میں فرد کو مساوی آزادی (یعنی سرمایہ دارانہ نظام زندگی کو) رد کرنے کا حق حاصل نہیں ہوتا، چنانچہ کوئی شخص اپنے فکر و عمل میں اتنا آزاد نہیں ہے، جس سے مغرب کا

اصول آزادی سلب یا رد ہو جائے مثلاً آپ یہ نہیں چاہ سکتے کہ کسی شخص کو شرعی منکر مثلاً بدکاری سے روک دیں، کیونکہ جونہی آپ اپنی اس چاہت پر عمل کریں گے، اس سے اصول آزادی کی خلاف ورزی ہو گی اور جمہوری ریاست جو ہیومن رائٹس کی بالادستی کا دم بھرتی ہے، آپ کو ایسا کرنے سے بذریعہ قوت روک دے گی۔[24]

مندرجہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہیومن رائٹس اور اس کے اصول پر استوار جدید ریاست، صرف ہیومن رائٹس کو اختیار کرنے کی آزادی فراہم کرتی ہے مگر انہیں رد کرنے، چیلنج کرنے اور تبدیل کرکے کسی دوسرے تصور خیر یا نظام حیات کو نافذ یا جاری کرنے کی آزادی فراہم نہیں کرتی گویا کسی دین کو اپنی ذات کی حد تک آزمانے میں ہر شخص مکمل طور پر آزاد ہے اور لبرل فریم ورک اسے انفرادی سطح پر مذہب کو پریکٹس میں لانے کی بھی اجازت دیتا ہے۔ لیکن اس دین کو حق محض اور تنہا سچائی سمجھ کر ہیومن رائٹس فریم ورک کی جگہ نافذ کرنے کی قطعاً اجازت اور آزادی نہیں دیتا۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مغرب بھی اپنے عقیدہ کی حد تک اسی قدر شدت پسند اور بنیاد پرست واقع ہوا ہے جس قدر وہ اسلام کسی دوسرے مذہب کو شدت پسندی اور بنیاد پرستی کا طعنہ دیتا ہے۔

اس ضمن میں جناب زاہد صدیق مغل رقم کرتے ہیں:

"درحقیقت خیر کے باب میں لبرل جمہوری ریاست بھی اتنی ہی راسخ فکر (dogmatic) اور غیر رواداد (Intolerant) ہوتی ہے، جتنی ایک مذہبی ریاست۔ دونوں ہی اپنے تصورات خیر سے متصادم کسی نظریے کی بالادستی کو روا نہیں رکھتیں چنانچہ مشہور لبرل مفکر جان رالز کے مطابق مذہبی آزادی کو لبرل ازم کے لیے خطرہ بننے کی اجازت نہیں دی جاسکتی اور جو مذہبی نظریات، لبرل آزادیوں (یعنی فرد کے تعیین خیر و شر کے حق) کا انکار کریں، ان کو عملاً کچل دینا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کسی وبا کو ختم کرنا ضروری ہوتا ہے۔"[25]

اسلام اور مغرب کے اس رویے میں ایک واضح فرق یہ بھی ہے کہ اسلام کسی شخص کو اختیار اسلام میں بالکل آزادی دیتا ہے اور جو شخص دائرہ اسلام سے خارج ہے، اسلام اسے اس بات پر مجبور نہیں کرتا کہ وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو جائے بلکہ اسے مکمل اختیار دیتا ہے کہ وہ غور و فکر، ارادے اور چاہت کی بنیاد پر اسلام کو اختیار کرے اور اگر وہ اسلام اختیار نہیں کرے گا تو اسلام اس سے کوئی تعرض نہیں کرے گا، تاہم اس قدر آزادی اور اختیار کے بعد، کسی کے اسلام چھوڑنے پر اس کے خلاف ارتداد کا قانون حرکت میں آئے گا، لیکن جدید لبرل فریم ورک میں کسی بھی شخص کا یہ اختیار ہی ختم ہو جاتا ہے اور اسے لبرل فریم ورک کو ماننے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

خلاصہ کلام:

خلاصہ کلام یہ ہے کہ از روئے اسلام، انسانی حقوق پر مبنی اقوام متحدہ کا عالمی منشور حق و باطل کا ملغوبہ ہے، یہی باعث ہے کہ بعض علمائے کرام نے ذو معنی اصطلاحات کی بنیاد پر اسے قبول کیا ہے۔ آزادی مذہب کے باب میں منشور کے آرٹیکل ۱۸ کا پہلا حصہ، اسلام کی رو سے بالکل درست اور برحق ہے کہ مذہب اختیار کرنے میں ہر شخص آزاد ہے مگر اس آرٹیکل کا دوسرا حصہ سراسر باطل ہے کہ مذہب تبدیل کرنے میں بھی انسان آزاد ہے۔ اس منشور کے آفاقی ہونے کا دعویٰ بھی غیر حقیقی، غیر علمی اور غیر اخلاقی ہے۔ اقوام متحدہ اور مغربی ممالک کے افکار و نظریات کے رد و قبول میں اختیار کا حق کسی شخص کو حاصل نہیں ہے لہٰذا مقالہ نگار کے نزدیک اہل مغرب کو بھی اسلام کے قانون ارتداد پر تنقید کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے!

حواشی و حوالہ جات

1. بنیادی حقوق، محمد صلاح الدین:۴۵، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۸۷
2. http://www.un.org/en/seetions/docouments/gernal-assebly-resolutons/
3. اقوام متحدہ کے متعلق بنیادی حقائق:۸۹۔۸۸، مطبوعہ دفتر اطلاعات عامہ، اقوام متحدہ، اسلام آباد، ۱۹۷۳
4. https://www.un.org/en/universal-declaration-human-rights

5. The Law of united Nations, By Hans Kelson, lawbook exchange, Limited,edition, 2, 2011, P:29

6. Draft Declaration on Rights and Duties of States, 1949, Article,6 http://legal.un.org/ilc/texts/instruments/english/commentaries/2-1-1949. pdf.

7. دستور اسلامی جمہوریہ پاکستان:۵،ترجمہ شدہ ایڈیشن، جنوری ۲۰۱۵، قومی اسمبلی پاکستان

8. International Covernant for Civil and Political Rights, 1966, Article-18, Section-2 http://www.ohchr.org/en/professionalinterst/pages/ccpr.aspx

9. The God Delusion by Richard Dawkin: 287, bantam books, London, united kingdom,2006

10. https:\\en.m.wikipedia.org\wiki\Abdur-Rehman(Convert)

11. https:\\www.rand.org\pubbs\monographs\MG574.html

12. Diagnosis of Our time, by Karal Mannheim, P:15, toylor& francis, vol 3, 2013

13. https://icj-cij.org/en/statute

14. اسلام اور سیاسی نظریات:84-85، مفتی محمد تقی عثمانی، مکتبہ معارف القرآن، کراچی، ۲۰۱۰

15. انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر:۲۶۷، ابوالحسن ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنو، ۱۹۷۹

16. http://guides.loc.gov/federlist-papers.

17. http://en.m.wikpedia.org/wiki/united-nations-general-assembaly- resolution-217

18. ماہنامہ ساحل، مارچ۔اپریل2005، ص ۳۵

19. Theory of Justice by john Rawls, Harvard university press, London, England, 1971

20. Political Liberalism by john Rawls, Columbia university press, united states, 1993

21. The Law of People by john Rawls, Harvard university press, London, united kingdom, 1999

22. اسلامی بینکاری وجمہوریت کا پس منظر وتنقیدی جائزہ: ص۔182

23. المومن:۲۶؛ مرتد کی سزا، اسلامی قانون میں:۸۶،۱۷، اسلامک پبلی کیشنز لاہور، اپریل ۱۹۰۷

24. اسلامی بینکاری واسلامی جمہوریت؛ تنقیدی جائزہ:۱۵۷، زاہد صدیق مغل، وراثت لاہور

25. ایضا:۱۵